رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت

مُعَلِّم

نعیم صدیقی

سلفیہ مسلم ایجوکیشنل اینڈ ریسرچ ٹرسٹ جموں و کشمیر
جمعیۃ منزل، بریز شاہ، سری نگر ۱۹۰۰۰۱

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت

معلّم

DARASGAH
MOHAMMADIA AHLIHADEES
Waniyar Rathpora Srinagar.

نعیم صدیقی

سلفیہ مسلم ایجوکیشنل اینڈ ریسرچ ٹرسٹ جموں وکشمیر
جمعیۃ منزل بربرشاہ، سری نگر۔ ۱۹۰۰۰۱ (کشمیر)

Scanned with OKEN Scanner

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
بحیثیت معلّم

آغاز، خداوندِ علیم وحکیم کے نام سے جو اپنی پیدا کردہ ہر مخلوق کے لیے خلق کے ساتھ ہی ساتھ اس کی تقدیر معین کرتا ہے اور اس کے لیے راہِ ہدایت کی نشاندہی کرتا ہے۔ جس نے اپنے پیدا کردہ آدمؑ کو علم الاسماء کے اعزاز سے نوازا، اور جو تمام انسانوں کے لیے اوّلین معلّمِ حقیقت و ہدایت ہیں۔

صدہا سلام اس انسانِ عظیم پر جسے خود انسانوں ہی کے اندر سے بشیر و نذیر بنا کر اٹھایا گیا، اور ساری انسانیت کے لیے معلّمِ فلاح و سعادت کے منصب پر قیامت تک کے لیے مامور کیا گیا۔ وہ یہ کہ جس کی تعلیم کی صداقت اور جس کے معلمانہ کردار کی اعجاز آفرینی پر تاریخ کا یہ حیرت انگیز واقعہ گواہ ہے کہ سرزمینِ حجاز کے صحرائی کلاس روم میں معلّمؐ صدق و صفا سے درس لینے والی تہذیب ناآشنا قوم دیکھتے دیکھتے اقوامِ عالم کے لیے نہ صرف راستی، مساوات، عدل، اخوت، احسان اور امن کی رہنما بن گئی بلکہ اس نے تدبر و تفکر کی کنجیوں سے علوم و فنون کے بند خزانوں کے دروازے ساری نوعِ انسانی کے لیے کھول دیے۔ حق یہ ہے کہ حضورؐ ہی کی تیار کردہ جماعت نے بین الاقوامی دورِ تہذیب کا افتتاح کیا، اور آج کے فاسد علوم اور بے توازن تحریکوں میں جہاں کہیں کسی قابلِ قدر جوہر کا کوئی ذرہ چمکتا دکھائی دیتا ہے، یہ اسی قوم محمدؐ کے فیضان کی یادگار ہے جو دوسروں کو منزل کا سراغ بتانے کے بعد خود اپنا سراغ گم کر بیٹھی۔

اصل مبحث کا آغاز کرنے سے پہلے میں اپنے اس احساسِ ندامت کو پیش کرنا چاہتا ہوں کہ ملّتِ اسلامیہ ہونے کی حیثیت میں ہم نے نبیِ پاکؐ جیسے عظیم ترین معلّمِ ایمان و

عمل کی پیروی کا حق ادا نہیں کیا۔ ہمارا مقام یہ تھا کہ ہم حضورؐ کو اپنی تمام فکری و عملی سرگرمیوں میں سرچشمۂ ہدایت تسلیم کرتے، اپنے کاروانِ حیات کو ہر پیچ و خم تاریخ سے گزارتے ہوئے حضورؐ کا دامنِ قیادت تھامتے، اور سیاست و اقتصاد اور تعلیم و دفاع اور دوسرے تمام شعبہ ہائے کار میں حضورؐ کے معلمانہ منصب سے روشنی حاصل کرتے۔ مگر ہماری افسوسناک حرکت یہ ہے کہ ہم اُس ہستی کو جو قائدِ تہذیبِ انسانی تھی، ایک آراستہ و پیراستہ عجائب خانۂ عقیدت میں مسند آرا کر کے اپنے قافلہ ہائے فکر و عمل کو وادی وادی میں گھماتے پھرتے ہیں۔ موجودہ بحران زدہ تہذیب کے بدراہ اور پراگندہ فکر اکابر کے دروازوں پر ہدایت کی بھیک مانگنے کے لیے مرعوبیت کا کشکول اٹھائے صدا لگاتے ہیں۔

تاریخ اور علم کے اُفق پر اُبھرنے والے نت نئے "آفلین" کی عارضی درخشانی کو دیکھ کر جھومتے ہوئے پکار اُٹھتے ہیں کہ یہ رہا ہمارا مقصود نظر۔ پھر جب جگنو کی سی چمک دکھا کر آنکھوں کا ایک تارا ڈوب جاتا ہے، تو پھر کسی اور کو تلاش کر کے اُس پر مٹتے ہیں۔ ہمیں کبھی اس کا احساس تک نہیں ہوتا کہ حضورؐ کے ہوتے ہوئے ہم کیسی کیسی ٹھنگنی اور بھینگی شخصیتوں کی تقلید میں ٹامک ٹوئیے مارتے پھرتے ہیں۔

دوسری تمہیدی بات مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ دُنیا میں، اور دُنیا کے کسی بھی معاشرے میں بڑے بڑے بحران اس وقت آتے ہیں جب خود علم تاریکیوں میں گھر جاتا ہے، جب تعلیم بھٹک جاتی ہے، جب مکتب اپنے مقصود کو گم کر دیتا ہے، اور جب معلم اپنا فریضہ اور پارٹ صحیح طور سے ادا نہیں کرتا۔ علم اور تعلیم کے بھٹکے ہوئے خورشید و مہ کے پرتو میں نہ سیاست صحت مند رہ سکتی ہے، نہ جمہوریت نشو و نما پاتی ہے، نہ اقتصادی عدل قائم ہو سکتا ہے، نہ اخلاقی شعور اتنا زوردار ہوتا ہے کہ جرائم کا راستہ روک سکے، نہ قومی خودی اس حد تک توانا ہو سکتی ہے کہ بین الاقوامی مسائل کو حل کرنے کے لیے دفاعی سفارتی اور نشری قوتوں کو صحیح طور سے بروئے عمل لا سکے۔

دورِ غلامی تو الگ رہا، آزادی پانے کے بعد بھی ہم لوگ تعلیم کے بھٹکے ہوئے خورشید کے پرتو میں ۲۴ سال سے جادۂ پیمائی کر رہے ہیں۔ اسی کا نتیجہ وہ بحران ہے جو

DARASGAH
MOHAMMADIA AHLIHADEES
Waniyar Rathpora Srinagar.

بالکل ابتدا سے آہستہ آہستہ پرورش پاکر اب پوری طرح جوان ہوگیا ہے۔

اور اگر ہم نگاہ کو ذرا سا وسیع کرکے پورے عالمی احوال کو دیکھیں تو اِس حقیقت سے انکار کرنا ممکن نہیں کہ علوم وفنون، تنظیمات، و ادارات ذرائع و وسائل اور تفریحات و تعیشات کی تیز رفتار افزائش کے باوجود انسان تہذیبی بحران سے دوچار ہے۔ جنگوں، انقلابات، قومی و طبقاتی تعصبات، طرح طرح کے منافرت انگیز متصادم نظریات اور منحوس قسم کے خونخوار جرائم کے ہجوم میں کھڑا ہوا بے بس انسان دل و دماغ کا سارا سکون گنوا کر ہمدردی کے ایک مخلصانہ بول کے لیے ترس رہا ہے۔

پس آج ملکی اور قومی لحاظ سے بھی، اور عالمی لحاظ سے بھی زندگی کو سنوارنے کے لیے سب سے زیادہ توجہ طلب شعبہ، تعلیم کا شعبہ ہے۔ اسی کی درستی پر ہماری اپنی سلامتی کا بھی انحصار ہے، اور اسی کو صحیح اُصول و مقاصد کے سانچے میں ڈھال کر ہم نئی نسلوں کو اس قابل بنا سکتے ہیں کہ فسادِ بحر و بر میں مبتلا دُنیا کو امن و انصاف کا راستہ دکھا سکیں۔

میرے مقالے کا مقصد یہی ہے کہ ہم اپنے نظامِ تعلیم کی درستی کے لیے حضور خاتم النبیین کی معلمانہ حیثیت کو سامنے رکھ کر کچھ مفید اشارات و نکات اخذ کرسکیں۔

حضورؐ کے معلمانہ کارنامے پر کوئی گفتگو اس وقت تک بے معنی ہوگی جب تک ہم اُس حکمتِ علم اور حکمتِ تعلیم پر نظر نہ ڈال لیں جس کے مطابق حضورؐ نے سارا معلمانہ کام کیا۔

ہماری حکمتِ علم

علم کیا ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ اور اس کے ذرائع حصول کیا ہیں؟

اِن سوالوں کو چھیڑتے ہوئے جب ہم مغرب کے نظریۂ علم (THEORY OF KNOWLEDGE) کو دیکھتے ہیں تو پھر ہم پیروانِ محمدؐ اور حاملینِ قرآن کی حیثیت سے یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اِس رائج شدہ باطل نظریۂ علم کی وجہ سے تمام علوم بگڑا کر رہ گئے ہیں۔ ان میں جو تھوڑے بہت سچائی کے اجزاء ہیں وہ غلط افکار و تصورات کے ساتھ اِس بُری طرح خلط ملط ہوگئے ہیں کہ ان کے ذریعہ زندگی کو پوری طرح خیر و خوبی سے آراستہ کرنا ناممکن ہے، اور جو نظامِ تعلیم محض ان علوم و افکار کو منتقل کرنے کا

وسیلہ بن کے رہ گیا ہو، وہ نہ ہمیں مسلمان کے سے ایمان و کردار سے آراستہ کر سکتا ہے، اور نہ انسانیت کو موجودہ بحرانی دَور سے نجات دلا سکتا ہے۔

مغربی نظریۂ علم کی رو سے حقیقت صرف وُہ ہے جسے ہم حواس اور قیاس کے ذریعے پا سکتے ہیں۔ ہمارے حواس اور قیاس کے دائرے سے باہر خواہ کتنے ہی بڑے سے بڑے حقائق موجود ہوں، ہمارے لیے کالعدم ہیں۔ ہم ایک خاص مرحلے میں جو کچھ اور جتنا کچھ جس شکل میں سمجھتے ہیں، جان لیتے ہیں، اس مرحلے میں وہی کچھ حقیقت ہے، بعد میں اگر نئی معلومات پچھلے مسلّمات کو بدل دیتی ہیں تو حقیقت نئی صورت اختیار کر کے سابق صورتوں کو منسوخ کر دیتی ہے۔ اس نظریۂ علم کا منطقی تقاضا یہ ہے کہ ہمارا سارا سرمایۂ علم، کسی بھی مرحلے میں، ایسے یقینیات سے خالی رہے جن پر ہم انفرادی اخلاق اور اجتماعی تہذیب کی تاسیس کر کے مطمئن ہو سکیں کہ فی الجملہ ہم نے صحیح عمارت اُٹھائی ہے، اور اب مزید معلومات و تجربات کی مدد سے اسے بنانے سنوارنے کا کام جاری رکھنا ہے۔ آج کے علمی ظنّیات ایسی ٹھوس بنیادی حقیقتیں فراہم کرنے سے قاصر ہیں جن کو ہم تعمیرِ حیات کے عمل میں قابلِ اعتماد اساسیات قرار دے سکیں۔ آج کے نظریے، آج کی تحریکیں، آج کے سماجی نظام، آج کے معاشرے اُس طرح کے ریت کے گھروندے ہیں جنہیں بچے ساحلِ سمندر کی ریت سے بناتے ہیں، پھر اپنے حاصلِ محنت کو توڑتے ہیں اور بار بار اسی کھیل کو دکو دوہراتے ہیں۔ غضب یہ کہ وہ اس کھیل کھیل میں اپنے اپنے گھروندوں کو صحیح اور بہتر اور دُوسروں کے ریت کے قلعوں کو غلط اور گھٹیا قرار دے کر آپس میں لڑتے بھی ہیں۔

اِس تنقیدی گفتگو کو طول دینے کے بجائے میں اُس حکمتِ علم پر مثبت گزارشات پیش کرتا ہوں جسے حضورؐ نے سامنے رکھا۔

واضح رہے کہ یہاں علم کی وہ ٹیکنیکل اقسام زیرِ بحث نہیں ہیں، جن کا مقصد زندگی کی مختلف ضروریات پوری کرنے کے لیے اسباب و وسائل پیدا کرنا اور ان کو ترقی دینا ہے۔ یہاں مدارِ گفتگو علم کی وہ اقسام ہیں جن کی روشنی میں انسانی رابطوں، رویّوں اور تہذیبی اداروں کی غایات طے کی جاتی ہیں۔

واضح رہے کہ یہاں علم کی وہ ٹیکنیکل اقسام زیر بحث نہیں ہیں، جن کا مقصد زندگی کی مختلف ضروریات پوری کرنے کے لیے اسباب و وسائل پیدا کرنا اور ان کو ترقی دینا ہے۔ یہاں مدارِ گفتگو علم کی وہ اقسام ہیں جن کی روشنی میں انسانی رابطوں، رویّوں اور تہذیبی اداروں کی غایات طے کی جاتی ہیں۔

اس سلسلے میں نبیِ پاکؐ نے بہ حیثیت معلّم انسانیت ہمارے سامنے اوّلین حقیقت یہ رکھی ہے کہ علمِ کامل صرف خدا کو حاصل ہے[1] وہی کائنات کے اسرار و رموز کا جاننے والا ظاہر و پنہاں سے آگاہ، اور ماضی اور مستقبل کا خبیر و بصیر ہے۔

انسان کو جو کچھ علم حاصل ہے یا آئندہ ہوگا وہ سب اسی کا عطیہ ہے[2]۔ انسان کو جو محدود ذرائع علم حاصل ہیں، وہ اسی کے عطا کردہ ہیں۔ سماعت، بصارت اور تفکر کی قوتیں اسی نے دی ہیں[3]۔ انسانی علم کے متعلق یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ وہ صدیوں کی حاصل کردہ ترقیوں کے باوجود اور مستقبل کے ہونے والے انکشافات سمیت بہت ہی محدود ہے[4]۔ خدا کے علمِ کامل کو سامنے رکھتے ہوئے جب انسان کو اپنے علمِ قلیل کی محدودیت کا اندازہ ہو جائے تو لازمی طور پر اس میں ایک تو طلبِ علم پیدا ہوگی۔ اور دوسرے وہ علمِ کامل کے سرچشمہ سے استفادہ کرنے کے لیے کوشاں ہوگا اور اس سے استفادہ کے وسیلے کو تلاش کرے گا جو صاحبِ علمِ کامل اور اس کے زیرِ تعلیم متعلم کے درمیان بروئے عمل موجود ہونا چاہیے۔ اپنے علم کی محدودیت کا شعور انسان کو اس جسارتِ بے جا سے بھی

---

[1] ملاحظہ ہوں آیات: اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ (۶۷-۲۶، ۴۶-۲۳) اِنَّ اللّٰهَ عَالِمُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳۵-۳۸) یَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ (۶-۳) واللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ (۲۴-۳۰) وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا (۶-۸۰) یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ (۲-۲۵۵) [2] ملاحظہ ہو آیت: عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ (۹۶-۵) [3] ملاحظہ ہو آیت: وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ (۶۷-۲۳) [4] ملاحظہ ہو آیت: وَمَاۤ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا (۱۷-۸۵)

روکنے کا ذریعہ ہے کہ وہ اپنی ناقص اور مشکوک معلومات پر نت نئے نظاموں اور تمدنوں کے بے ڈھنگے اور غیر متوازن ڈھانچے کھڑے کرے، ان پر اندھا دھند انسانی قربانیوں اور محنتوں کی بھاری مقداریں صرف کرے، اور پھر وہ یکے بعد دیگرے خوفناک تباہی کے ساتھ ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے رہیں۔ حضورؐ کی حکمتِ علم انسان کو یہ بتاتی ہے کہ انسانی علم کائنات میں خدائی اور کارفرمائی کا پارٹ ادا کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ بلکہ اِس علم کی محدودیت گواہ ہے کہ انسان بندگی و نیابت کے مقام پر رہ کر کسی بالاتر ہستی کے زیرِ ہدایت کام کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے[1]

علمِ قلیل کے مقام پر ہونے کی وجہ سے انسان مجبور ہے کہ وہ نہ صرف حسّی اور قیاسی ذرائع سے کام لے کر اپنے علم میں مسلسل اضافہ کرے، بلکہ حسّی و قیاسی دائرے سے بالاتر کسی دُوسرے ذریعۂ علم کا بھی سُراغ لگائے جو تعمیرِ حیات کے لیے چند یقینی اساسیات مہیا کر سکے۔ پس انسان ایک لامتناہی وادیٔ علم کا مسافر ہے جس کے لیے کہ کھولنے کی منزل کہیں نہیں آتی۔ حضورؐ کے ذریعے اضافۂ علم کی دُعا جذبۂ طلبِ علم کو متحرک رکھنے کے لیے سکھائی گئی ہے[2]

مگر دوسرے نظریوں کے مقابلے میں اسلامی حکمتِ تعلیم یہ چاہتی ہے کہ مسافرِ علم کے سامنے کچھ نشاناتِ راہ ضرور واضح ہوں، اس کے پاس کچھ نہ کچھ زادِ راہ بھی ہو، اور وہ مشعل بھی ساتھ رکھتا ہو جو تاریکیوں میں راستہ دکھا سکے۔ نبیٔ اکرمؐ کی عطا کردہ قرآنی حکمت کے رُو سے تین حقیقتیں ایسی ہیں جن کے صحیح شعور پر انفرادی کردار اور اجتماعی نظام کی صحت کا دارومدار ہے۔

ان میں سے اوّلین حقیقتِ عظمیٰ (SUPEREME REALITY) خدا کی ہستی ہے۔ یہاں میں خدا کی ہستی پر دلائل نہیں دوں گا۔ کہنا یہ ہے کہ اسلامی حکمتِ علم کی

---

[1] ملاحظہ ہو آیت: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (۵۱-۵۶)

[2] ملاحظہ ہو آیت: رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا۔ (۲۰-۱۱۴)

بنیاد تصورِ خدا پر ہے۔ اس کی ذات، اس کی صفات اور اس کے حقوق کا شعور ہی انسانی زندگی کی فلاح کا ضامن ہے۔

دوسری بڑی حقیقت خود انسان ہے۔ انسان خدا کی ساری مخلوق میں امتیازی مرتبہ رکھتا ہے۔[1] اس کا منصب خدا کی عبادت یعنی پرستش و اطاعت ہے[2] وہ اگر صحیح روش پر چلے تو اس کے لیے خلافت و نیابت کا درجہ بلند ہے[3] اسے عقل و علم سے بہرہ ور کرنے کے ساتھ ساتھ تمیزِ خیر و شر دی گئی ہے[4] بنا بریں وہ ذمہ دار اور جوابدہ ہے[5]

تیسری بڑی حقیقت مادی کائنات ہے جو نامعلوم محرکات کے تحت کسی حادثے کے طور پر نہیں بن گئی، وہ رام لیلا یا کھیل تماشا نہیں ہے[6] وہ بے مقصد و بے نتیجہ نہیں ہے[7] اس کی ایک غایت ہے[8] اس میں نظم و ترتیب ہے[9] اس میں ہر چیز اٹل قوانین میں جکڑی

---

[1] ملاحظہ ہوں آیات: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ .... (۱۷-۷) وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (۹۵-۴)

[2] ملاحظہ ہوں آیات: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ .... (۲-۲۱) وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔

[3] ملاحظہ ہوں آیات: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ .... (۲۴-۲۵)

[4] ملاحظہ ہو آیت: وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (۹۰-۱۰)

[5] ملاحظہ ہو آیت: اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا (۲۳-۱۱۵)

[6] ملاحظہ ہوں آیات: وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ (۲۱-۱۶) لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ (۲۱-۱۷)

[7] ملاحظہ ہو آیت: رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (۳-۱۹۱)

[8] ملاحظہ ہو آیت: خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ (۶۴-۳، ۱۶-۳)

[9] ملاحظہ ہو آیت: هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ (۶۷-۳)

ہوئی ہے[1] اس میں توازن ہے[2] اور اس میں حسن و زیبائی ہے[3]۔ پوری کائنات ایک ہی کُل ہے جو ایک ہی قوت کے زیرِ فرمان چل رہی ہے[4] اس کائنات کی تمام مادّی اشیاء اور قوتیں جن تک انسان کی دسترس ہو، اس کے لیے "متاع" کی حیثیت رکھتی ہیں[5] اور اُن سے وہ بہ حیثیتِ نائبِ الٰہی فائدہ اٹھانے اور اُن کو حدود اللہ کے اندر رہ کر استعمال کرنے کا مجاز ہے۔ کائنات مادّی کے موجودات اور اُن کی قوتوں سے کام لینے کے لیے ان کا علم حاصل کرنا بھی ضروری ہے، اِس علم کو حضورؐ نے علم ایدان قرار دیا ہے۔ یعنی وہ علم جو مجسم موجودات نامی و غیر نامی — اور ان کی قوتوں اور ان کے اِستعمالات سے بحث کرتے ہیں۔

اِن سہ گانہ حقیقتوں کے درمیان سفر کرنے والے طالبِ علم کے سامنے حقائق کے دو بڑے دائرے آتے ہیں۔ ایک ظواہر و محسوسات کا دائرہ، دوسرا اُمورِ غیب[6] کا دائرہ۔

---

[1] ملاحظہ ہو آیت ... مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ (۱۶-۱۲)

[2] " " " وَوَضَعَ الْمِيزَانَ (۵۵-۷)

[3] " " " إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا ..... (۱۸-۷) إِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزِينَةٍ الْكَوَاكِبِ (۳۷-۶) وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ (۱۵-۱۶) حَتَّىٰ إِذَا أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ ... (۱۰-۱)

[4] ملاحظہ ہوں آیات: لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا (۲۱-۲۲) نیز قُل لَّوْ كَانَ مَعَهُ آلِهَةٌ كَمَا يَقُولُونَ إِذًا لَّابْتَغَوْا إِلَىٰ ذِي الْعَرْشِ سَبِيلًا (۱۷-۴۲)

[5] ملاحظہ ہو آیت: ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (۳-۱۴) وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (۲-۲۴-۲-۳۶)

[6] امورِ غیب کی کئی اقسام ہیں۔ مثلاً:

ایک وہ تمام اُمور جو ماضی و مستقبل کے دائرے میں پائے جاتے ہیں۔ نیز ایسے دُور رس اور وسیع الاثر قوانین و عوامل جو صدہا تاریخی واقعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ پھر اخلاقی و تمدنی سلسلۂ اسباب و علل کے وُہ بے حساب اور ناقابلِ استقصاء نتائج جو

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۴ پر)

امورِ غیب محسوسات کے پردے کے پیچھے ہیں اور اُن تک براہِ راست رسائی حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ ہمیں نہیں دیا گیا لیکن ہم اُمورِ غیب سے بالکل بے نیاز ہو کر بھی نہیں چل سکتے۔ ہر فردِ انسانی چند نمایاں سوالات سے دوچار رہتا ہے کہ آیا کوئی خالق و مالک ہے یا نہیں؛ یہ زندگی ایک وقتی ظہور ہے یا اسے موت کے بعد بھی کسی شکل میں جاری رہنا ہے؛ ہم اپنے اعمال سے جو کچھ اور جیسے کچھ نتائج فوری طور پر پالیتے ہیں۔ بس معاملہ ان ہی پر ختم ہے یا کسی باقاعدہ قانون کے تحت عدل و انصاف کے مطابق ان کے صحیح اور مکمل نتائج ملنے ہیں؛ زندگی کا معاشی اور جنسی کامرانیوں سے بلند تر بھی کوئی مقصد ہے؛ اِن سوالات کا جواب طے کیے بغیر زندگی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

ہزارہا اشخاص سے ہوتے ہوئے کئی نسلوں تک پھیلتے جاتے ہیں، اور بسا اوقات ان کا دائرۂ وسعت عالمگیر ہوتا ہے۔ (واضح رہے کہ الہامی علم و ہدایت میں ایسے حقائق و امور کی بھی نشاندہی کی جاتی ہے)

دوسرے وہ امور جو ایک وقت میں کسی کے لیے غیب ہیں، کسی کے لیے شہود۔ جیسے اس وقت کہاں کہاں بارش ہو رہی ہے یا مثلاً ایک آدمی ریلوے ٹائم ٹیبل دیکھ کر یہ جان چکا ہے کہ فلاں نام کی گاڑی کس جگہ، کب آنے والی ہے اور اب کس مقام سے گزر رہی ہوگی، لیکن اس بارے میں دوسرے بے شمار لوگ لاعلم ہیں یا مثلاً ایک شخص کسی خاص زبان یا علم و فن کا مطالعہ کرنے کی وجہ سے بے شمار ایسے امور سے واقف ہوتا ہے جن کو دوسرے نہیں جانتے۔

تیسرے وہ اُمور جو ایک زمانے کے لوگوں کے لیے دائرۂ غیب میں ہوتے ہیں اور دوسرے زمانے میں شہود بن جاتے ہیں۔ جیسے ریڈیو، بجلی یا جوہری توانائی کا وجود، یا جیسے چاند کی حقیقت کے بہت سے گوشے جو خلائی جہازوں کے اِستعمال سے قبل نامعلوم تھے، یہ ساری اقسام ممکن الشہود غیب کی تعریف میں آتی ہیں۔

چوتھے وہ امور جنہیں ہم محض اشیاء و حوادث کے علم کی ہزار وسعتوں کے بعد بھی براہِ راست نہیں جان سکتے۔ مثلاً خدا کی ہستی، سلسلۂ وحی و الہام، حیات بعد الموت وغیرہ۔

اپنی بحث میں اس معنی میں ہم نے اُمورِ غیب کی اصطلاح اِستعمال کی ہے۔

کی سرگرمی کو حسن وخوبی سے جاری نہیں رکھا جا سکتا۔ ہر شخص اثباتاً نہیں تو نفیاً شعوری طور پر نہیں تو نیم شعوری طور پر، باقاعدہ اِستدلال سے نہیں تو ظن وتخمین سے اِن سوالات کے جوابات طے کرتا ہے اور پھر اس کی زندگی اس کے پسندیدہ جوابات کے مطابق کوئی نہج اختیار کرتی ہے۔

اِن اُمورِ غیب کے متعلق انبیاء وحی والہام سے حاصل کردہ علم کو ہمارے سامنے رکھ کر کائنات اور تاریخ کے شواہد سے ثابت کر کے دکھاتے ہیں کہ الہامی رہنمائی کو پیش کرنے اور قبول کرنے والے ہی فلاح پاتے ہیں۔

اِس سلسلے میں یہ وضاحت شاید مفید ہوگی کہ تاریخ کے مطالعہ میں اسلامی حکمتِ علم جس چیز پر ہماری توجہات کو مرتکز کرتی ہے وہ "سنۃ اللہ"[1] اور "اَمراللہ"[2] ہے۔ اِس سنۃ اللہ اور اَمراللہ کے زیرِعنوان آنے والے قوانین ونوامیس میں سے جو زیادہ جامع، بدیہی اور اساسی ہیں، ان کی تصریح مثالوں کے ساتھ قرآن نے کردی ہے۔ تاریخ کا صحیح مطالعہ کر کے مزید شواہد دریافت کیے جا سکتے ہیں۔

اِسی طرح مطالعۂ کائنات کے سلسلے میں قرآن کی ایک اصطلاح بہت اہم ہے اور وُہ ہے "آیت"۔ جس طرح آیاتِ قرآن علمِ حقیقت اور علمِ حوادث سے بہرہ مند ہونے کے لیے ہماری رہنما ہیں۔ اِسی طرح مادّی کائنات میں پائے جانے والے تمام مظاہر تلاشِ حقیقت کے سفر میں ہمارے لیے نشاناتِ راہ ہیں[3] اور ان پر بھی آیات کا اطلاق ہوتا ہے۔ کائنات کی "آیات" سے ایک فلسفی اور ایک سائنس داں یکساں اِستفادہ کر سکتے ہیں بلکہ ان آیات میں جمال کا جو پہلو پایا جاتا ہے، اِس سے ادیب، شاعر، مصوّر اور جملہ فنونِ لطیفہ کے وابستگان بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو آیت: ۱۷-۷۷

[2] ملاحظہ ہوں آیات: ۸-۴۴، ۱۱-۱۶، ۱-۱۶، ۳۳-۳۸۔

[3] ملاحظہ ہوں آیات: ۱۲-۱۰۵، ۱۶-۱۲، ۱۳، ۱۶-۶۷-۱۲- ۷۰، ۳-۱۳، ۱۰-۹۲

MOHA
Wanivar Rathpora Srinagar.
PARASGAH
MOHAMMADIA AHLIHADEES
Wanivar Rathpora Srinagar.

یہاں اِس اشارے کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ کائنات کی آیات اور تاریخ میں کام کرنے والے نوامیس الٰہی تعلیم کی آیات سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ اور یہی ہم آہنگی الہامی تعلیم کی صحت و صداقت کے لیے ایک مؤثر عقلی دلیل قرار پاتی ہے۔

اس الہامی ذریعۂ علم سے ہمارے حسی و قیاسی ذرائع حصولِ علم کی کوتاہی کی تلافی ہوتی ہے اور ہمیں ایسے یقینیات حاصل ہو جاتے ہیں جن پر انفرادی کردار اور اجتماعی تمدن کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ یہ الہامی یقینیات نظامِ تمدن میں اسی ضرورت کو پورا کرتے ہیں، جیسے ریاضی میں دو اور دو چار کا فارمولا ہے۔

نبوت جہاں ہمیں بعض تفصیلی احکام و قوانین اور حدود و شعائر کا سرمایہ فراہم کرتی ہے۔ وہاں اس کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ وہ ہمیں "العلم" (THE KNOWLEDGE) یا اساسی علم (THE BASIC KNOWLEDGE) بہم پہنچاتی ہے! اس کے ذریعے ہمیں مرکزی حقیقتِ عظمیٰ (THE GREAT CENTRAL REALITY) اور بنیادی صداقتوں (BASIC REALITIES) نیز مستقل اخلاقی قدروں (PERMANENT MORAL VALUES) کی دولتِ نایاب ہاتھ آتی ہے، اس قسم کے اٹل یقینیات کو قرآن "قولِ ثابت"[1] قرار دیتا ہے کہ جو کردار اور تہذیب کی اساس کے طور پر اپنی جگہ قائم رہتے ہیں، ان اساسی حقائق و قوانین کے چوکھٹے میں دیگر تفصیلی ضوابط ترتیب پاتے ہیں۔

یہی وہ علم ہے جسے ورثۃ الانبیاء قرار دیا گیا اور یہی وہ العلم ہے جس کے متعلق حضورؐ نے فرمایا کہ اس کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے[2] ورنہ اگر یہاں علم سے مراد جملہ اقسام کے علوم لیے جائیں تو پھر ہر مسلمان پر لازم ہوگا کہ وہ روئی دُھننے اور چمڑے کی دباغت کرنے

---

[1] ملاحظہ ہو آیت: يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ (۱۴-۲۷)

[2] ملاحظہ ہو حدیث: طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَمُسْلِمَةٍ (مشکوٰۃ کتاب العلم)

کرنے سے لے کر انجینئری اور ڈاکٹری اور جوہری توانائی اور خلائی پرواز تک کے سارے علوم حاصل کرے اور نہ کرسکے تو ترک فرض کے جرم کی سزا کا مستحق قرار پائے۔ فی الحقیقت سارے کا سارا قرآن اسی "العلم" کا آئینہ دار ہے اور نبی اکرمؐ نے بہ حیثیت معلم کتاب و حکمت اصل زور اسی العلم کو پھیلانے پر صرف کیا ہے۔ اس کی مختصر جامع تعریف حضورؐ نے ان الفاظ میں کی ہے کہ "وہ علم جس کے ذریعے اللہ کی رضا حاصل کی جاتی ہے۔"

(روایت ابوہریرہ۔ مشکوٰۃ کتاب العلم)

علم کا آخری مقصد کیا ہے؟ قرآنی اصطلاحات کے مطابق اس سوال کے جواب میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ علم حق کے ذریعے عملِ صالح کا حصول، اعمالِ صالحہ سے حیاتِ طیبہ کی تشکیل، اور حیاتِ طیبہ سے نفسِ مطمئنہ کے مقام تک رسائی — علم کا مقصود ہے۔

اگر ذرا اور اجمال سے کام لیا جائے تو کہنا یہ چاہیے کہ علم کا کام یہ ہے کہ وہ غلط اور صحیح، حق اور باطل، مفید اور مضر، نیکی اور بدی کو الگ الگ چھانٹ کر ہمارے سامنے رکھ دے تعلیم نبوت کا منتہا رشد و غی میں امتیاز پیدا کر دینا ہے[1] نبی کی تعلیم کا فرقان ہونا لازم ہے[2]

اسلامی حکمتِ علم کی پوری تفاصیل کو سمیٹنے کے لیے ایک مستقل مقالہ چاہیے یہاں محض بیان کردہ چند نکات پر اکتفا کیے بغیر چارہ نہیں۔ البتہ یہ غلط فہمی رفع کر دینا ضروری ہے کہ العلم کی متذکرہ اہمیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دوسرے طبعی اور عقلی علوم سے توجہ ہٹائی جائے جن کی مدد کے بغیر انسانی زندگی کی بہت سی ضروریات پوری نہیں ہوسکتیں۔

قابلِ لحاظ بات صرف یہ ہے کہ ہمیں "العلم" کی اساس پر تمام علوم کو مدوّن کرنا چاہیے اور اپنے نظامِ تعلیم اور نصابیات کے لیے اسی کو محور بنانا چاہیے۔ یہ ہے تعلیمی انقلاب کا نقطۂ آغاز جس کو کار پردازانِ تعلیم نے اب تک نہیں سمجھا اور ہم ایک ناسازگار

---

[1] ملاحظہ ہو آیت: قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (۲-۲۵۶) [2] هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ (۲: ۱۸۵)

اور نامطلوب نظامِ تعلیم کے زنداں میں محبوس ہیں۔

حضورؐ ایک تعلیمی تحریک کے سربراہ تھے!

جب کبھی کوئی نبی اُٹھتا ہے تو وہ ایک ہمہ گیر تہذیبی انقلاب اور ایک تعلیمی تحریک کا علمبردار بھی ہوتا ہے۔ حضورؐ بھی زندگی کے ہر شعبے میں تبدیلی لانے کے لیے دینِ حق کو لے کر مبعوث ہوئے اور عقائد و افکار سے لے کر احکام و قوانین تک ہر چیز کی تعمیرِ نو کا کام آپ کے سامنے تھا۔ اِتنا بڑا کام انجام دینے کے لیے حضورؐ معلّم الناس ہی نہیں تھے، ایک وسیع تعلیمی تحریک کے سربراہ بھی تھے۔

اسلام جس طرح دینِ ہدایت ہے، اِسی طرح بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ دینِ علم اور دینِ تعلیم و تعلّم بھی ہے۔ جس دین کا آغاز حکم "اِقرأ"[1] سے ہوتا ہے جس کے اصل مخاطب اولوالالباب[2] ہوں جس کے اسرار و رموز کو پا کر ایمان کے معیارِ کمال تک پہنچنے والے الراسخون فی العلم ہوں[3] جو براہین پیش کر کے مخالفین سے بیّنات و براہین طلب کرتا ہو،[4] جو تدبر و تفکر کا مطالبہ کرتا ہو، اور جو سمع، بصر اور فؤاد سے کام نہ لینے والوں کو مویشیوں سے بدتر قرار دیتا ہو[5] جو کتابِ الٰہی کا بوجھ اٹھا کر اس میں غور و فکر نہ کرنے والوں کو ایسے گدھے سے تشبیہ دیتا ہو جس پر علم کا دفتر لدا ہو[6] اس کے بارے میں یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ وہ اِسلام کے لیے ایک تعلیمی تحریک کی حیثیت

---

[1] اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ (۹۶:۱)

[2] لِيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۳۸-۲۹)

[3] وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ (۳:۷)

[4] ملاحظہ ہو آیت هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲۸-۷۵)

[5] ملاحظہ ہوں آیات: هُمْ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (۷-۷۹)

[6] ملاحظہ ہو آیت: مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا (۶۲-۵)

رکھتا ہے۔

دینِ حق کی تعلیمی تحریک کے سربراہ کی حیثیت سے حضورؐ کے لیے پورا معاشرہ کلاس روم تھا، اور آپ ذہنی و فکری لحاظ سے بھی تعلیم دینے والے تھے۔ اخلاقی و معاشرتی لحاظ سے بھی فریضۂ تعمیر ادا کرنے والے تھے، سیاست و اقتصاد کے دائروں میں بھی صراطِ مستقیم کی نشاندہی کرنے والے تھے اور مخالف و مزاحم تخریبی قوتوں کے مقابلے میں جنگاہ کے اندر بھی کمان کرنے والے تھے۔ حضورؐ نے عملاً تعلیمی تحریک چلا کر توسیعِ علم کے لیے جو کام کیا اس کا بڑا نمایاں نتیجہ یہ نکلا کہ جن لوگوں تک حضورؐ کا پیغام پہنچا ان کے اندر طلبِ علم کی اتھاہ پیاس پیدا ہو گئی۔ اور جوں جوں دینِ حق پھیلتا گیا ہر قسم کی علمی ترقیات کی رفتار تیز ہوتی چلی گئی۔

نبیٔ اکرمؐ کا معلمانہ منصب اور حکمتِ تعلیم

قرآن میں ایک سے زیادہ مرتبہ حضورؐ کو معلّم کتاب و حکمت اور مُزکّی قرار دیا گیا ہے[۱] حضورؐ خود اپنے آپ کو معلّم قرار دیتے ہیں[۲] مسجدِ نبوی میں بیک وقت آپؐ ایک طرف حلقۂ ذکر دیکھتے ہیں اور دوسری طرف مجلسِ تعلیم و تعلّم، تو دونوں کا استحسان کرتے ہوئے مجلسِ تعلیم کو ترجیح دے کر اس میں جا شریک ہوتے ہیں[۳] حضورؐ نے رات کے تھوڑے سے حصّے میں تعلیم دینے کو شب زندہ دارانہ عبادت سے افضل قرار دیا[۴]

آئیے ذرا ایک نظر اُس تعلیمی حکمت پر بھی ڈالتے چلیں جس سے حضورؐ نے بہ حیثیت معلّم کام لیا اور بعد کے معلمین کے لیے واضح نشاناتِ راہ چھوڑ گئے۔ حضورؐ کی حکمتِ تعلیم کے نکات کو نمبروار پیش کیا جا رہا ہے۔

(۱) قرآن میں حضورؐ کے لیے معلمانہ ذمہ داری کو بلاغِ مبین تک محدود کر دیا گیا ہے[۵]

---

[۱] ملاحظہ ہوں آیات: ۲-۶۲، ۲-۱۱۱، ۳-۱۶۴۔ [۲] مشکوٰۃ۔ کتاب العلم۔ روایت عبداللہ بن عمرؓ۔

[۳] ایضاً [۴] مشکوٰۃ۔ کتاب العلم۔ روایت ابن عباسؓ۔

[۵] ملاحظہ ہو آیت: فعلیکَ البلاغ (۳-۱۰، ۱۳-۱۴) و دیگر آیات

یعنی وضاحت سے بات پہنچا دینا اور تفہیم کا حق ادا کر دینا ہر سچے مُعلّم کی معلمانہ ذمہ داری ہے۔

(۲) اُوپر کے اصول کا دوسرا پہلو یہ کہ کر حضورؐ پر واضح کیا گیا کہ آپ مخاطب لوگوں کے لیے چوبدار یا جبّار نہیں بنائے گئے ہیں[۱] یعنی معلمانہ کام کی رُوح محبت و خیر خواہی ہے۔ اِس فریضہ کو انجام دینے میں جبر و تشدد کی اسپرٹ راس نہیں بیٹھتی۔

(۳) حضورؐ کو جو حکمتِ تعلیم سکھائی گئی اِس کا تقاضا یہ ہے کہ معلّم نرم خو ہو۔ تند خو نہ ہو[۲] بصورت دیگر یا تو زیرِ تعلیم جماعت تتر بتر ہو جائے گی یا آج کل کے نظام میں اگر اسے کلاس رُوم میں بیٹھنے کا پابند کیا گیا تو کم سے کم طلبہ کے دِل و دماغ ضرور کلاس روم سے فرار کر جائیں گے۔ حضورؐ نے خود اپنے رفقائے کار کو ہدایات دیں کہ لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کرو، مشکلات نہ پیدا کرو، ان کو بشارت دینے والے بنو، نفرت دلانے والے نہ بنو[۳]

(۴) حضورؐ کے سامنے اپنا تعلیمی نصب العین پوری طرح واضح تھا یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر کاربند ایک ایسی مرکزی جماعت کا تیار کرنا جو ساری انسانیت کے سامنے خدا پرستانہ نظامِ حیات کی صداقت کی گواہی دے سکے اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ اِس نظامِ حیات کو چلانے کے لیے ایمان و کردار سے آراستہ لیڈر، افسر، کارکن اور شہری تیار کیے جائیں۔

(۵) حضورؐ کی حکمتِ تعلیم ہمیں معلمانہ کام کا مشرقی تصور دلاتی ہے۔ ہر نبی نے اپنی مخاطب قوم کو تعلیم حق دیتے ہوئے یہ اعلان کیا تھا کہ میں تم سے اِس خدمت کا کوئی معاوضہ

---

[۱] ملاحظہ ہوں آیات: وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ (۵۰-۴۵) لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (۸۸-۲۲)

[۲] ملاحظہ ہو آیت: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ (۳-۱۵۹) نیز ملاحظہ ہو: وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ (۱۵-۸۸)

[۳] حدیث: يَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا، بَشِّرُوا وَلَا تُنَفِّرُوا (ریاض الصالحین۔ باب الحلم والافادۃ والرفق روایت حضرت انس) نیز حدیث: اِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِينَ وَلَمْ تُبْعَثُوا مُعَسِّرِينَ۔ بخاری روایت ابی ہریرہ۔

PARASGAH
MOHAMMADIA AHLIHADEES
Wanivar Rathpora Srinagar.

نہیں مانگتا[1] میرا اجر تو اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے۔ یہی اصول حضورؐ کا بھی تھا اور آپ نے اپنے تیار کردہ معلمین کو اس سے منع فرمایا کہ وہ شاگردوں اور طلبہ سے کوئی حق الخدمت وصول کریں۔

اِس اصول سے یہ بات لازمی نتیجے کے طور پر اخذ ہوتی ہے کہ معلّم کا کام کسی بڑھئی یا ترکھان یا آہنگر کی طرح ایک پیشہ ورانہ کام نہیں ہے کہ جس نے پیسے دیے اس کے حسبِ منشا کام کر دیا۔ بلکہ یہ مشنری اسپرٹ سے کرنے کا کام ہے اور اُسے وہی انجام دے سکتا ہے جو اس چیز کا خود قائل ہو اور اس پر ایمان رکھتا ہو جس کی تعلیم دینے وہ چلا ہے۔ اسلامی نظامِ تعلیم میں مخالفینِ اسلام یا منافقین کے لیے کام کرنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ چنانچہ حضورؐ کا ایک ارشاد ہے کہ منافق میں تفقہ فی الدین کی صفت نہیں پیدا ہو سکتی۔[2]

(۶) تعلیم کے اس مشنری تصور کے ساتھ جب بڑے پیمانے پر تعلیمی ادارات قائم کر کے کثیر التعداد معلمین سے ان کا پورا وقت لیا جانا ہو تو اس صورت میں یہ ذمہ داری ریاست کی ہے کہ وہ ان کی کفالت کا انتظام کرے۔

(۷) تعلیم کے مشنری کام کو سرانجام دینے کے لیے اُوپر کے اشارات کے مطابق معلّم میں جہاں اپنے مخاطبین کے لیے محبت و خیر خواہی اور نرم خوئی کے جذبات ہونے چاہئیں۔ وہاں حضورؐ کے مسلک کا تقاضا یہ ہے کہ خوش آئند طرزِ تکلّم اختیار کیا جائے[3] اور بحث و اختلاف کا موقع پیش آئے تو جدالِ احسن سے کام لیا جائے یعنی خوشگوار انداز میں تبادلۂ خیالات کیا جائے۔[4]

(۸) حضورؐ کی حکمت تعلیم کا ایک تقاضا یہ تھا کہ لوگوں سے ان کی عقلی و ذہنی استعداد کے مطابق خطاب کیا جائے۔ اس میں عمر کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا۔ شہری اور دیہاتی

---

[1] ملاحظہ ہو آیت: لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا (۳۶-۲۱)

[2] مشکوٰۃ۔ کتاب العلم۔ روایت ابی ہریرہؓ

[3] ملاحظہ ہو آیت: قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (۲:۸۳)

[4] ملاحظہ ہو آیت: وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (۲۹-۴۶)

کے فرق پر بھی نگاہ رکھنی ہوگی، مبتدی اور منتہی کے مراتب کا خیال بھی کرنا ہوگا۔

(۹) حضورؐ نے تعلیم و تربیت میں تدریج کے اصول کو اختیار کیا۔ ایک حدیث میں قبائل میں جا کر تعلیم و تبلیغ کا کام کرنے والوں کو یہ ہدایت فرمائی کہ چھوٹتے ہی دین کے سارے تقاضے لوگوں کے سامنے رکھ کر انہیں دہلا نہ دیا جائے بلکہ پہلے انہیں اسی کلمہ کا قائل بنایا جائے، پھر اگر وہ توحید و رسالت کو مان لیں تو ان کو نماز کی دعوت دی جائے۔[۱]

(۱۰) حضورؐ کی حکمتِ تعلیم میں ایک اصولی بات یہ ملتی ہے کہ آپ مخاطب جماعت کی اکتاہٹ کا پورا خیال رکھتے تھے کہ تعلیم و خطاب کا سلسلہ اتنا بوجھل نہیں ہونا چاہیے کہ لوگ اُکتانے لگیں۔ عبداللہ بن مسعود نے حضورؐ کی اس خوبی کو بیان کیا ہے کہ آپ مناسب وقفوں پر خطاب فرماتے تھے۔[۲]

حضورؐ کے اس اصول کی ایک شہادت حضرت ابن عباس کی طرف سے حضرت عکرمہ نے ہم تک پہنچائی ہے کہ ابن عباس نے حضرت کے مسلک کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہیں یہ تلقین کی کہ لوگوں کو ہفتے میں ایک بار جمعہ کے دن تعلیم دو۔ اگر زیادہ کی ضرورت ہو تو دو بار یا حد سے حد تین بار۔[۳]

اس اصول کی بنا پر حضورؐ ہمیشہ مختصر تعلیمی خطاب فرماتے تھے جو تیر بہدف ہوتے تھے۔ حضورؐ کا سب سے طویل خطبہ حجۃ الوداع کا خطبہ ہے۔ مگر وہ بھی اپنی جگہ بے حد مختصر ہے۔

پھر ایک خاص بات یہ سامنے آتی ہے کہ احادیث میں مختلف افراد اور مجالس سے حضورؐ کی جن تعلیمی گفتگوؤں کا ریکارڈ ملتا ہے، ان میں سے بعض میں ایک بات، بعض میں دو باتیں اور بعض میں چار یا پانچ باتیں ملتی ہیں۔ کوئی مثال ایسی نہیں ہے کہ

---

[۱] حدیث (مشکوٰۃ۔ کتاب الزکوٰۃ۔ روایت ابن عباس)

[۲] حدیث (مشکوٰۃ۔ کتاب العلم۔ روایت عبداللہ بن مسعود (مسلم و بخاری)

[۳] حدیث (مشکوٰۃ۔ کتاب العلم۔ روایت عکرمہ۔ (بخاری)

بیسیوں تلقینات اور نصیحتیں ایک ہی سانس میں کر ڈالی گئی ہوں۔

(۱۱) تعلیم و تدریس کے لیے طلبِ علم کی ذہنی فضا موجود ہونا ضروری ہے، چنانچہ حضورؐ کی معلمانہ حکمت[۱] یہ تھی کہ مجالسِ صحابہ میں جب تشریف لاتے تو جن موضوعات پر گفتگو ہو رہی ہوتی، ان کا تسلسل جاری رہنے دیتے، اور خود بھی ان میں حصہ لیتے۔ تعلیمی گفتگو کے لیے آپ یا تو طلبِ علم کی فضا کے متلاشی رہتے جو کسی سوال یا بحث یا اجتماعی تقاضے سے از خود پیدا ہو جاتی، یا پھر خوبصورت طریقے سے ایسی فضا پیدا فرماتے۔ اسی بنا پر حضرت ابنِ عباس نے یہ کہا کہ جب کسی مجلس کے لوگ اپنی باتوں میں مشغول ہوں تو ان کی باتوں کو منقطع کر کے تعلیم و تبلیغ شروع نہ کرو بلکہ خاموش رہو، تا آنکہ لوگ خود ہی حصولِ علم کی خواہش کریں، یعنی کوئی سوال اُٹھائیں[۲]

(۱۲) معلّمی کا فریضہ اس وقت تک ادا نہیں ہو سکتا جب تک کہ معلّم اپنے مخاطب گروہ کی توجہات کو مرتکز نہ کرے۔ چنانچہ حضورؐ نے توجہات کو اپنی بات کی طرف مرتکز کرنے کے لیے مختلف مؤثر صورتیں اختیار فرمائیں۔ مثلاً:

کبھی چونکا دینے والی کسی بات سے آغازِ کلام کیا گیا۔ جیسے یہ قرآنی پیرایۂ آغاز سورہ کہ "آن پہنچا اس کا فیصلہ"[۳]

کبھی سوال سے گفتگو شروع فرماتے مثلاً کیا تم فلاں بات جاننا چاہتے ہو یا کیا میں تم کو بھلائی کے راستے نہ بتاؤں؟ یا مثلاً هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا[۴] یا مثلاً خطبۂ حجۃ الوداع کے آغاز میں مجمع سے دریافت کیا یہ کونسا شہر ہے؟ یہ کونسا مہینہ ہے؟ یہ کونسا دن ہے؟[۵]

---

[۱] حدیث (مشکوٰۃ۔ کتاب العلم۔ روایت عبداللہ بن عمرو)

[۲] مشکوٰۃ۔ کتاب العلم۔ روایت عکرمہ۔

[۳] ملاحظہ ہو آیت: ۱۶-۱ [۴] ملاحظہ ہو آیت: ۱۸-۱۰۳

[۵] حدیث بخاری و مسلم۔ باب قصہ حجۃ الوداع۔ روایت جابرؓ بن عبداللہ و عائشہؓ

کبھی کوئی حیرت زار منظر ذہنوں کے سامنے آراستہ فرما دیتے مثلاً "جب آسمان پھٹ جائے گا" جب تارے جھڑ جائیں گے اور جب دریا اپنی رودگاہوں سے باہر نکل کر آپس میں مل جائیں گے اور جب قبریں کھول دی جائیں گی"[1]

اس سلسلے میں زیادہ مثالیں پیش کرنا غیر ضروری ہے۔

(۱۳) اصولِ تکرار سے بھی حضورؐ نے بارہا کام لیا۔ کسی اہم بات کو ذہن نشین کرانے کے لیے تین تین بار اسے دہراتے۔ اسی طرح کسی کے ہاں تشریف لے جاتے تو تین مرتبہ اجازت طلب فرماتے۔[2]

(۱۴) حضورؐ نے کارِ تعلیم کے لیے مختلف دائرے اور مختلف سطحیں مقرر فرمائیں۔

— ایک دائرہ عمومی تعلیم کا تھا۔

— دوسرا دائرہ خصوصی مجالس کا تھا جن کا مقصد معیاری علماء اور قائدین کو تیار کرنا تھا۔

— تیسرا دائرہ خواتین کی تعلیم کا تھا جس کے لیے آپ نے ہفتے میں ایک دن مخصوص کر دیا تھا اور جس کے لیے حضرت عائشہؓ کو مامور فرما کر لوگوں کو تلقین فرمائی کہ دین کا آدھا علم، یعنی نظامِ معاشرت اور خواتین کے متعلق معلومات ان سے حاصل کرو۔

— چوتھا دائرہ خاص خاص موقعوں پر خاص خاص افراد کو انفرادی توجہ سے تعلیم و تربیت دینے کا تھا۔

— پانچواں دائرہ باہر سے حصولِ تعلیم کے لیے آنے والے وفود کو تیار کر کے قبائل میں فروغِ تعلیم کے لیے واپس بھیجنے کا تھا۔

(۱۵) "العلم" کے علاوہ حضورؐ نے ہر قسم کے مفید علوم و فنون کے سیکھنے کی طرف توجہ

---

[1] ملاحظہ ہو آیت: ۸۲ - ۱ تا ۴

[2] حدیث۔ مشکوٰۃ۔ کتاب الاستیذان۔ روایت ابو سعید خدری۔

دلائی۔ نوشت وخواند کو پھیلانے کی سعی فرمائی۔[1] صحتِ زبان کے اہتمام کی تلقین کی، فنِ کتابت کے لیے ہدایات دیں۔ صحابہ کو عبرانی زبان سیکھنے اور تورات کا علم حاصل کرنے پر متوجہ کیا۔ میدانِ بدر میں مجاہدین کی صف بندی کرا کے اور آغازِ جنگ کے لیے انہیں پابندِ فرمان بنا کر اور کوڈورڈز کی تعلیم دے کر دفاعی نظام کا بالکل نیا تجربہ شروع کیا۔[2] نوجوانوں کی تعلیم جہاد دینے کے لیے دوڑ اور تیراندازی کے مقابلے کرائے، عین میدانِ جنگ سے قلعہ شکن آلات بنانے کی تربیت حاصل کرنے کے لیے صحابہ کی ایک جماعت کو مقامِ جرش کی طرف بھیجا۔[3]

خواتین کو اس دور کی ضروریات کے مطابق چرخہ کاتنے کی نصیحت کی۔ قریش کی عورتوں میں بچوں کی تربیت کا جو سلیقہ پایا جاتا تھا۔ اس کی تحسین کر کے اس صلاحیت کو بڑھانے کا راستہ نکالا تھا۔ زیرِ تربیت رفقاء کو استیذان کے آداب سکھائے، پراگندہ بالوں کو ترشوانے اور کنگھی کر کے سنوارنے کی تلقین کی، عیدین کے تہوار مسرت سے منانے کے لیے جائز حدود میں تفریح کا موقع پیدا کیا، شادی بیاہ کے موقعوں پر اعلانِ نکاح کر کے مسرت آمیز انداز سکھائے اور لوگوں کو صحنوں کی صفائی کی نصیحت کی اور راستوں سے کانٹے اور کوڑا کرکٹ ہٹانے کی تربیت دی۔ نیز خندہ پیشانی کے ساتھ لوگوں میں میل جول کے آداب سکھائے۔

حضورؐ کا یہ وسیع تصورِ تعلیم قرآن کے جس کلیہ حکمت پر مبنی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو آخرت کی بھلائی کے ساتھ دنیا میں بھی بھلائی حاصل کرنی ہے۔[4]

(۱۶) حضورؐ نے اپنی تعلیمی حکمت میں جسم کے حقوق کو پوری اہمیت دی۔ قرآن نے

---

[1] حدیث۔ مشکوٰۃ۔ کتاب الآداب۔ روایت زید بن ثابت (ترمذی)

[2] حدیث۔ مشکوٰۃ۔ کتاب الجہاد۔

[3] ملاحظہ ہو آیت: وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ (۸-۶۰)

[4] ملاحظہ ہو آیت: رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۲-۲۰۱)

حضرت طالوت کو بنی اسرائیل کی سیاسی قیادت پر مامور کرتے ہوئے یہ معیارِ انتخاب پیش کیا ہے کہ ان کو علم اور جسم دونوں سے برتری حاصل ہے،[1] اسی معیار کے مطابق حضورؐ نے جسم کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر فرمایا کہ فانّ لجسدک علیک حقّ[2] اس موقع پر حضورؐ کا یہ ارشاد قابلِ توجہ ہے کہ قوی مومن کمزور مومن سے بہتر ہے[3] — جسم کی ضروریات مدِّ نظر رکھنے کا ثبوت وہ طبّی تعلیم بھی ہے جو حضورؐ نے اس دور کے فنِ طب کے مطابق اپنے پیروؤں کو دی[4]

(۱۷) حضورؐ نے تعلیم کے فروغ کے لیے سوال کو یہ فرما کر بڑی اہمیت دی کہ علم ایک صندوق ہے جس کی کنجی سوال ہے۔ یعنی سوالات اُٹھانا اور سوالات کا خیر مقدم کرنا بھی منصبِ معلّمی کا لازمہ ہے۔

(۱۸) حضورؐ نے جدید دور کے فلسفیوں سے بہت پہلے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ تعلیم کا آغاز مہد سے ہونا چاہیے اور اس کا تسلسل لحد تک جاری رہنا چاہیے[5]

(۱۹) حضورؐ کی حکمتِ تعلیم کا ایک سبق یہ ہے کہ علم یہ دیکھ کر سیکھو کہ کس سے سیکھ رہے ہو۔ یعنی آیا تمہارا معلّم و استاذ بلحاظِ قابلیت اور بلحاظِ کردار قابلِ اعتماد ہے؟[6]

اس ارشاد کی روشنی میں ایک اسلامی ریاست کے لیے یہ لازم آتا ہے کہ وہ

---

[1] ملاحظہ ہو آیت وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (۲-۲۴۷)

[2] حدیث: ریاض الصالحین۔ باب فی الاقتصاد فی الطاعۃ۔ روایت عمرو بن العاص۔

[3] " " " باب فی المجاہدہ۔ روایت ابو ہریرہؓ۔

[4] احادیث و رباب طب۔ زاد المعاد از حافظ ابن القیم۔ ج ۳۔ ذکر الادویہ والاغذیہ۔ نیز ملاحظہ ہو: الاصابہ از ابن حجر و طبقات الاطباء عن ابن ابی اصیبعہ۔

[5] حدیث: اُطْلُبُنَ الْعِلْمَ مِنَ الْمَهْدِ إِلَى اللَّحْدِ۔ منہاج المتعلم (بحوالہ تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ از شلبی [6] مشکوٰۃ۔ کتاب العلم۔

معلموں کے انتخاب میں بڑی چھان بین سے کام لے اور نہ صرف ان کی سندات اور علمی قابلیت کا جائزہ لے، بلکہ بلحاظِ کردار ان کے خاندانی پس منظر اور تعلیمی دَور کے ریکارڈ کو بھی زیرِ غور لائے، جن لوگوں کو نئی نسل کے خیالات اور کردار کی تعمیر و تشکیل کا نازک ترین فریضہ سونپا جا رہا ہو، ان کے متعلق دُوسری ملازمتوں کے اُمیدواروں سے زیادہ سخت چھان بین ہونی چاہیے۔ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ آیا معلّمی کا کوئی امیدوار محض پیشہ ورانہ ذہنیت کے ساتھ آ رہا ہے یا اس کے اندر صحیح مشنری جذبہ موجود ہے۔ بلکہ ملازمت میں آنے کے بعد بھی اساتذہ کے کردار کا ریکارڈ زیرِ نظر رکھنا چاہیے اور جہاں کہیں کوئی آدمی اس کام کے لیے غیر موزوں نظر آئے اسے فوراً اس مقدس ذمہ داری سے الگ کر دیا جائے۔

(۲۰) حضورؐ نے ایسے علم سے بچنے کے لیے خدا کی پناہ طلب فرمائی جس سے لوگوں کو نفع نہ ہو۔[1] اس کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ کسی شخص کا علم حاصل کر کے اسے روک کر بیٹھ رہنا علم کی منفعت کو ضائع کرنا ہے، دُوسرے یہ کہ بعض علوم و فنون ایسے ہو سکتے ہیں جو کوئی ٹھوس افادیت اِنسانوں کے لیے نہ رکھتے ہوں۔

(۲۱) حضورؐ نے علم اور دماغی قوتوں کے غلط اِستعمالات سے پرہیز کی تاکید کی ہے۔[2] مثلاً آپ نے جبر و قدر کے مسئلے پر ایک ایسی بحث کرنے سے صحابہؓ کو روک دیا جس میں ایک فریق حقیقت کے ایک نصف حصّے کو لیے ہوئے تھا اور دوسرا فریق دوسرے نصف حصّے کو اور سچائی کے دونوں حصّوں کو آپس میں ٹکرایا جا رہا تھا۔ اِسی سلسلے میں آپؐ نے فرمایا کہ قرآن کے ایک حصّے کو اس کے دوسرے حصّے سے نہ ٹکراؤ۔ واضح رہے کہ بحث و مناظرہ کی بیشتر صورتوں میں جو باعثِ تفرقہ و انتشار ہوتی ہیں یہی خرابی پائی جاتی ہے۔

پھر آپ نے ایسے سوالات پر بحث کرنے سے منع فرمایا جن کا نتیجہ سوائے گمراہی

---

[1] حدیث۔ مشکوٰۃ۔ باب الاستعاذہ۔ روایت زید ابن ارقم و ابو ہریرہؓ۔

[2] حدیث۔ مشکوٰۃ۔ باب الایمان والقدر۔ روایت ابو ہریرہؓ۔

کے کچھ نہیں۔ مثلاً یہ سوال کہ خدا کو کس نے پیدا کیا؟[1] اس طرح کے سوالات سے منع کیا گیا ہے کہ جس دائرۂ حقائق کے لیے ہمیں ذرائع علم دیے ہی نہیں گئے۔ اس میں قدم رکھنے سے سوائے گمراہی کے کچھ حاصل نہیں۔

(۲۲) ایک ہدایت حضورؐ نے یہ دی ہے کہ علم کے ذریعے مغالطہ نہ دیا جائے[2] اور یہ حقیقت ہے کہ دُنیا کے بیشتر اہلِ علم اور دانش وَر اپنی ذہنی برتری کے ذریعے کم علم اور سادہ دِل لوگوں کو مغالطے دیتے ہیں۔ آج بے شمار ایسے حکیمانہ اقوال اور دانشورانہ نکات کو علم و استدلال اور پروپیگنڈے کے زور سے ناقابلِ تردید کلیات کا مقام دے دیا گیا ہے۔ جن کا تجزیہ کریں تو وہ ایک دلفریب مغالطہ ثابت ہوتے ہیں۔ پوری نوعِ انسانی کو آج کے علم نے چند بڑے بڑے مغالطوں کا شکار بنا دیا ہے۔ ایسے دائرہ ہائے امورِ غیب میں قدم رکھنے سے بھی روکا جن تک آدمی کے علم کی سرے سے دسترس ہی نہیں اور نہ ایسے دوائر کے لیے اسے وسائلِ علم دیے گئے ہیں۔[3]

حضورؐ نے جحود بآیات اللہ، یعنی خدا کی آیات کی مخالفت کرنے کو شدید قسم کے نقصانِ علم کا موجب بتایا[4] جس کے اثر سے سمع، بصر اور فواد کی قوتیں بھی صحیح طور پر کام نہیں کر سکتیں۔

(۲۳) بچوں کے متعلق حضورؐ کی حکمتِ تعلیم ہمیں ایک خاص نقطۂ نظر دیتی ہے جس کے چند نمایاں ارشادات یہ ہیں:

— حضورؐ نے بچوں کی معصومیت کی تعبیر یہ کہہ کر فرمائی کہ یہ تو جنت کے باغوں کے

---

[1] حدیث۔ مشکوٰۃ۔ باب الوسوسہ۔ روایت ابو ہریرہؓ (ابو داؤد)

[2] حدیث۔ مشکوٰۃ۔ کتاب العلم۔ روایت معاویہ

[3] ملاحظہ ہو آیت: وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (۱۷-۳۶)

[4] ملاحظہ ہوں آیات: وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ (۲۹-۴۹) وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ (۲۱-۳۰)

پھول ہیں، یعنی ان سے محبت و ملاطفت کا برتاؤ کرنا چاہیے[1]

— پھر بچوں کے متعلق یہ فرمایا کہ وہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتے ہیں، بعد میں گھر اور معاشرے کا ماحول انہیں کسی دوسرے رنگ میں رنگ دیتا ہے[2]

— میرے نزدیک فطرتِ اسلام سے مراد وہی بات ہے جو قرآن میں تمام انسانوں کے لیے کہی گئی ہے[3] اور اس کی تشریح ایک دوسری حدیث سے ہوتی ہے جس میں حضورؐ فرماتے ہیں کہ ہر فرزندِ آدم کے اندر ایک آواز فرشتے کی ہوتی ہے اور ایک آواز شیطان کی، یعنی اس کے اندر خیر و شر کے دو گونہ رجحان پائے جاتے ہیں[4] اور اسی کے ساتھ ساتھ اسے تمیز خیر و شر کا میلان بھی دیا گیا ہے۔ اس ارشاد کی رُو سے یہ گھر، مدرسے اور معاشرے کی تعلیمی سرگرمیوں پر منحصر ہے کہ وہ بچے کے اندر نیکی کی ملکوتی آواز کو زوردار بنا دیں، یا بدی کی شیطانی پکار کو غالب کر دیں۔

— پھر بچوں کی تربیت کے سلسلے میں حضورؐ نے والدین کو یہ تاکید بھی کی کہ وہ اپنی ساری اولاد سے مساوات کا معاملہ کریں، بصورتِ دیگر بچوں میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی اصول اجتماعی نظامِ تعلیم پر بھی لاگو ہوگا۔ درسگاہوں میں تمام طلباء کے ساتھ مساویانہ معاملہ ہونا چاہیے اور سب کے لیے حقوق و فرائض کی یکسانی کے ساتھ، اساتذہ کا رویہ ایک ہی جیسا ہونا چاہیے۔

— حضورؐ کی حکمتِ تعلیم نے نظریۂ سزا بھی دیا جس کے دو نکات ہیں۔ ایک یہ شدید ضرورت کے تحت سات سال کی عمر سے سزا دی جا سکتی ہے[5] دوسرے

---

[1] حدیث: مشکوٰۃ۔ کتاب الوسوسہ۔ بحوالہ حضرت عائشہؓ۔ (مسلم)

[2] حدیث: مشکوٰۃ۔ باب الایمان بالقدر، روایت ابوہریرہؓ (مسلم)

[3] ملاحظہ ہو آیت: فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (۳۰۔۳۰)

[4] حدیث: اِنَّ لِلشَّيْطَانِ لَمَّةً بِابْنِ اٰدَمَ وَلِلْمَلَكِ لَمَّةٌ۔ الخ مشکوٰۃ کتاب الایمان۔ روایت ابن مسعودؓ

[5] حدیث: مشکوٰۃ الصلوٰۃ۔ روایت عمرو بن شعیب (ابوداؤد۔ کتاب الایمان)

یہ کہ ایسی جسمانی سزا نہیں دی جانی چاہیے جو نشان چھوڑنے والی ہو۔ سخت قسم کے تھپڑ یا گھونسے یا بید یا قمچیاں نہیں لگانی چاہئیں۔ لازم نہیں کہ سزا جسمانی ہی ہو، اس کی دوسری صورتیں بھی ہیں۔ جیسے کہ نشوز کی صورت[1] میں عورتوں کو خواب گاہوں سے الگ کرنے کے قرآنی حکم کی مثال موجود ہے۔

نظریہ سزا کے سلسلے میں چند وضاحتیں ضروری ہیں۔

تعلیم کا بنیادی تقاضا محبت و شفقت ہے، سزا کی گنجائش محض غیر معمولی مواقع کے لیے استثنائی درجے میں رکھی گئی ہے۔

ب:۔ اس نظریہ سزا کے سامنے یہ حکیمانہ شعور بھی ہونا چاہیے کہ بگڑے ہوئے ماحول کے مقابلے میں اُس دورِ سعادت کا معاملہ الگ تھا جس کو پیشِ نظر رکھ کر حضورؐ نے نظریہ سزا بیان فرمایا۔ سنوری ہوئی سوسائٹی میں ڈسپلن توڑنے اور سرکشی کرنے کی مثالیں شاذ ہوتی ہیں، اور اُن پر معمولی سی سزا دینی بھی اس لیے مؤثر ہوتی ہے کہ پورا ماحول سزا دینے والے ہاتھ کے پیچھے ہوتا ہے۔ بگڑی ہوئی سوسائٹی میں جہاں بُرائی کی قوتوں حسین و دلکش اسالیب سے غلط روش کو مزین بنا کر سامنے لاتی ہوں اور ان کی وجہ سے فکری و اخلاقی محاذ پر ایک مستقل جنگ برپا ہو، دو ہی طرزِ عمل ہو سکتے ہیں یا تو سزا اصولِ عام بن جائے، مشفقانہ رویہ صرف نادر صورتوں میں سامنے آئے۔ یا پھر نیکی اور سچائی کے معلم اپنی شفقت کو اور زیادہ وسیع و عمیق بنا دیں۔ ظاہر ہے کہ پہلی صورت سزا کو غیر مؤثر بنا دے گی، لہٰذا دوسری صورت ہی مفید نتائج دے سکتی ہے۔

ج: سزا دہی کا معاملہ طبیب کی سی حکمتِ عملی کا تقاضا کرتا ہے۔ ہر قسم کے حالات میں موقع اور محل کی مناسبت کا لحاظ ضروری ہے۔

د: بعض اصحاب کو ایک حدیث سے غلط فہمی ہوتی ہے جس کی بنا پر حضورؐ نے فرمایا ہے کہ اولاد کے سروں سے تادیب کے عصا کو ہٹا نہ دیا جائے[2] یہاں تادیب کے عصا سے

---

[1] ملاحظہ ہو: سورۂ نساء۔ آیت ۳۴۔

[2] حدیث: ولا ترفع عنهم عصاك ادبا۔ مشکوٰۃ باب الکبائر و علامات النفاق۔ روایت حضرت معاذؓ

مراد سچ مچ کا عصا نہیں ہے بلکہ یہ ویسا ہی ہمارا استعاراتی اندازِ بیان ہے جیسے کہا جائے کہ اپنے مخالفین کو بھی احسان کی زنجیروں میں باندھ کر رکھو یا دشمن کو مارو تو بھلائی کی تلوار سے مارو۔ اگر کوئی شخص ان مواقع پر زنجیروں اور تلواروں کے لفظ کے لغوی معنی لے لے تو وہ صریحاً غلطی کرے گا۔ یہاں استعاراتی مفہوم لیا جاتا ہے۔ یعنی احسان کی زنجیروں اور بھلائی کی تلوار سے مراد احسان کی بھلائی کے سوا کچھ نہیں۔ ٹھیک اسی طرح تادیب کے عصا سے مراد محض تادیب ہی ہے۔ تادیب یا ادب سکھانا یا تربیت دینا ایک فنِ لطیف ہے۔

(۲۴) حضورؐ کی تعلیم کا مرکزی نصاب قرآن تھا[1] جو پوری انسانی زندگی کے لیے ایک جامع گائیڈ بک ہے۔ تعلیم کے بقیہ شعبے اسی مرکزی نصاب کے اردگرد مرتب ہوتے ہیں۔

(۲۵) سرکارِ رسالت مآبؐ کی حکمتِ تعلیم کا ایک لازمی تقاضا یہ ہے کہ جس طرح معلّم کو متعلمین کے ساتھ محبت و شفقت کا برتاؤ کرنا چاہیے۔ اس طرح متعلمین کے لیے لازم ہے کہ وہ معلّم کا ادب و احترام رکھیں[2] اس ہدایت میں یہ تقاضا از خود مضمر ہے کہ معلّم بلحاظِ قابلیت اور بلحاظِ کردار اور بلحاظِ معلمانہ روش کے ایسے اوصاف سے متصف ہو کہ طلباء میں اس کے لیے احترام نشوونما پائے۔

توسیعِ تعلیم کے لیے حضورؐ کی مساعی

اب اجمالاً ان مساعی پر نگاہ ڈالیے جو حضورؐ نے توسیعِ تعلیم کے لیے سرانجام دیں:

ایک طرف تو نظامِ صلوٰۃ، اس میں تلاوتِ قرآن اور خطباتِ جمعہ کا نظام بجائے خود فروغِ تعلیم کا ذریعہ تھا، دوسری طرف حضورؐ خاص مواقع پر زائد خطبات بھی دیتے اور تعلیمی مجالس بھی منعقد فرماتے۔

توسیعِ تعلیم کے لیے آپ کا یہ ارشاد بڑا اہم ہے کہ اچھے لوگ وہ ہیں جو معلّم

---

[1] متعدد احادیث: مشکوٰۃ۔ کتاب فضائل القرآن۔

[2] حدیث: تَوَاضَعُوْا لِمَنْ تَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُ (الجامع الصغیر الکامل لابن عدی۔ منہاج المتعلم)

ہوں یا متعلم[1] پھر آپؐ نے قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا کے قرآنی حکم کے تحت والدین پر ذمہ داری ڈالی کہ وہ اپنی اولاد کو تعلیم دیں[2]۔ پڑوسیوں کو پڑوسیوں سے علم حاصل کرنے کی تلقین کی۔

لکھنے کا ہنر عام کرنے کے لیے بدر کے قیدیوں کے لیے یہ فدیہ میں بھی مقرر کیا گیا کہ وہ مسلمانوں کو لکھنا سکھادیں[3]

حضورؐ نے دورِ مکہ میں دارِ ارقم کو جس طرح عبادات اور مشاورت کا مرکز بنایا، اسی طرح وہ تعلیم کا پہلا مرکز بھی تھا[4]

مدنی دور میں دوسرا وسیع تر اور باقاعدہ قسم کا مدرسہ صفہ کے نام سے مسجد نبوی میں قائم ہوا جس میں زیادہ تر باہر سے آنے والے نومسلم اور کچھ مقامی لوگ مقیم رہ کر تعلیم حاصل کرتے۔ اسے ڈاکٹر حمید اللہ اور ڈاکٹر احمد شلبی نے اقامتی درسگاہ قرار دیا ہے[5] اس درسگاہ میں نہ صرف قرآن کی سورتیں یاد کرائی جاتیں اور فنِ تجوید کی تعلیم دی جاتی تھی بلکہ لکھنے پڑھنے کا فن اور فقہ کا علم بھی سکھایا جاتا تھا[6] مسند امام احمدؒ بن حنبل کی ایک روایت کے مطابق درسگاہ صفہ کے طلبہ کی تعداد ایک موقع پر ستر تک پہنچی[7]

حضرت عبادہ بن صامت کا بیان ہے کہ خود انہوں نے چند اصحابِ صفہ کو قرآن اور کتابت کی تعلیم دی[8] اس درسگاہ کے ایک درخشندہ طالب علم حضرت ابوہریرہؓ تھے[9]

---

[1] حدیث۔ سننِ دارمی۔ المقدمہ۔ باب ۲۵۔۳۱

[2] ملاحظہ ہو سورۂ تحریم: آیت ۶۔

[3] مسند امام احمد بن حنبل۔ ج ۱، ص ۲۴۶۔ نیز الکامل للمبرد۔ ج ۱، ص ۱۷۱۔

[4] تاریخ الامم والملوک (طبری) بحوالہ ڈاکٹر احمد شلبی۔

[5] حدیث: سننِ ابن ماجہ۔ باب فضل العلماء والحث علیٰ طلب العلم۔

[6] مسند امام احمد بن حنبل۔ ج ۳، ص ۳۷۱۔ [7] ایضاً۔ [8] حدیث: ابوداؤد۔ کتاب البیوع فی کسب العلم۔ [9] مسلم۔ کتاب الفضائل۔ باب فضائل ابی ہریرہؓ بحوالہ تاریخ اسلام، معین الدین ندوی

حضورؐ کے توسیعِ تعلیم کے منصوبے کا ایک اہم جزو یہ تھا کہ ہر مسجد مرکزِ تعلیم بھی تھی۔ خود آنحضورؐ کے دور میں مدینہ میں نو مسجدیں[1] ایسی تھیں جہاں بڑوں اور بچوں کو دین اور قرآن اور معاملاتِ زندگی کی تعلیم دی جاتی تھی۔

توسیعِ تعلیم کے لیے حضورؐ مختلف قبائل کی طرف قرّاء کو بھجواتے۔ واضح رہے کہ درسگاہ صُفّہ کے فارغ التحصیل قرّاء کہلاتے تھے[2] قراء قاری کی جمع ہے، مگر یہ لوگ آج کل کے معنوں میں قاری نہ ہوتے تھے بلکہ تلاوتِ قرآن کے ساتھ ساتھ فہم قرآن اور تفقہ فی الدین میں مہارت حاصل کرتے تھے۔ یہ قراء فوجی دستوں کے ساتھ بھی علاقوں میں بھجوائے جاتے۔ تاکہ وہ خود مجاہدین کی تعلیم کا سلسلہ سفر میں بھی جاری رکھیں۔ اور اگر کوئی قبیلہ اطاعت قبول کرے تو اس کے لوگوں کو تعلیم دیں[3]

درسگاہِ صفہ کے ذریعے ان قراء کی تعداد اس تیزی سے بڑھی کہ ایک مرتبہ ستر قاریوں کا قافلہ علاقہ نجد کے قبائل کی تعلیم کے لیے روانہ کیا گیا۔ ان قیمتی ہستیوں کو بئر معونہ کے مقام پر ان فریب کار بدویوں نے شہید کر دیا جنہوں نے خود ہی درخواست کر کے ان کو بلوایا تھا[4]

جن ممتاز صاحبِ علم شخصیتوں کو حضورؐ کسی مقام پر اپنا عامل یا نمائندہ بنا کر بھیجتے ان کے ذمے وہاں کے لوگوں کو تعلیم دینے کا کام بھی کرتے۔ چنانچہ بنی حارث کی طرف خالد بن ولید کو بھیجا گیا تو ان کو تعلیم کی ذمہ داری بھی سونپی گئی[5] اسی طرح عمرو بن حزم عامل یمن کو حضورؐ نے تحریری ہدایات دیں کہ وہ لوگوں کو قرآن سکھائیں، اس میں تدبر و تفکر کی تربیت دیں اور انہیں آگاہ کریں کہ ان کے حقوق کیا ہیں؟ اور ان پر فرض کیا عائد ہوتے ہیں[6]

---

[1] عینی شرح بخاری، ج ۲، ص ۴۶۸۔ (بحوالہ تاریخ اسلام، معین الدین ندوی)

[2] حدیث: مسلم۔ کتاب الامارہ۔ ثبوت الجنۃ للشہید۔

[3] حدیث: بخاری، ج ۲۔ ص ۴۵۔

[4] حدیث: مسلم۔ کتاب الامارہ۔ باب ثبوت الجنۃ للشہید۔

[5] الوثائق السیاسیہ۔ مکتوب ۷۹ [6] ایضاً

سورۂ توبہ کی آیت ۱۲۲ کے مطابق مختلف نومسلم قبائل کے وفود مدینہ میں آکر قیام کرتے اور حضورؐ اور صحابہ سے علم حاصل کرکے واپس جاتے اور اپنے لوگوں کو تعلیم دیتے[1] اس قسم کا ایک وفد مالک بن الحویرث کی سرکردگی میں مدینے آکر ۲۰ روز تک مقیم رہا[2] بعض خاص مواقع پر حضورؐ نے خصوصی معلمین کا تقرر فرمایا۔

مثلاً سب سے پہلی مثال ہجرت سے قبل کی ہے جبکہ آپؐ نے اہل مدینہ کے لیے سعد بن العاص کا تقرر بہ طور معلم فرمایا اور انہیں مامور کیا کہ وہ دین سکھانے کے علاوہ لوگوں کو لکھنے کی تعلیم دیں۔ واضح رہے کہ حضرت سعد خوش نویس تھے[3] ان کے متعلق المجر کی روایت ہے کہ انہیں معلم حکمت کا لقب دیا گیا[4]

اسی طرح فتح مکہ کے بعد[5] حضرت معاذؓ کو مکہ کے نومسلموں کی تعلیم کے لیے مامور کیا گیا۔

ان مساعی کے واضح نتائج تاریخ ہمارے سامنے رکھتی ہے۔

وہ قوم قریش جس کے ہاں اسلام سے پہلے جملہ سترہ[6] آدمی نوشت وخواند جانتے تھے۔ ان کے نبی کے گرد مدینہ میں کاتبانِ وحی اور محررانِ مکاتیب کا ایک وسیع سیکرٹری ایٹ موجود تھا۔

مردوں کا معاملہ الگ رہا۔ پانچ خواتین بھی لکھنا پڑھنا سیکھ گئی تھیں اور وہ یہ تھیں: (۱) حضرت حفصہ بنت عمرؓ (۲) حضرت اُمِّ کلثوم بنت عقبہ (۳) حضرت عائشہ بنت سعد (۴) حضرت کریمہ بنت مقداد اور (۵) حضرت الشفاء بنت عبداللہ عدویہ جو حضرت حفصہ کی استانی تھیں[7] قرونِ اولیٰ میں ۴۲ ۵ اخواتین محدثات تھیں[8]

---

[1] تفسیر خازن۔ تفسیر مَا كَانَ لِلْمُؤْمِنِينَ لِيَنفِرُوا كَافَّةً (بحوالہ تاریخ اسلام مولانا معین الدین ندوی) [2] حدیث بخاری۔ باب الرحمۃ للبہائم (بحوالہ تاریخ اسلام معین الدین ندوی)۔ [3] المجر ورق ۵۹ (ابو داؤد) [4] ایضاً

[5] حدیث: بخاری۔ جلد ۱۔ ص ۷۴۔

[6] فتوح البلدان۔ بلاذری۔ ص ۴۵۸۔

[7] ابن حجر۔ الاصابہ۔ فی تمیز الصحابہ۔

آہستہ آہستہ اہلِ تخصص (SPECIALISTS) پیدا ہوئے جبکہ حضورؐ نے علمِ فرائض میں زید بن ثابت کو، قرآن خوانی اور تجوید میں ابی بن کعب کو، حرام وحلال کے احکام کا علم رکھنے میں حضرت معاذؓ بن جبل کو مرتبۂ اوّل پر شمار کیا[1] اسی طرح ایک موقع پر فرمایا کہ چار آدمیوں سے قرآن سیکھو: عبداللہ بن مسعود سے، سالم مولیٰ ابوحذیفہ سے، ابی بن کعب سے اور معاذ بن جبل سے[2]

کتنا حیرت ناک واقعہ ہے کہ یہ تیز رفتار تعلیمی سرگرمی ایسے حالات میں رُونما ہوئی جبکہ مسلسل ایمرجنسی کا دَور تھا اور مدینہ کی چھوٹی سی اسلامی ریاست کثیر التعداد دشمنوں کے حملہ ہائے مسلسل کی زد میں تھی۔ بات یہ ہے کہ اصل چیز تو یہ تعلیمِ دین ہی تھی جس کے بل پر ریاست کھڑی تھی اور جس کی دی ہوئی سپرٹ مسلمانوں کو معرکہ ہائے کارزار میں اپنے سے بڑی طاقتوں پر فتح دلا رہی تھی۔ اس تعلیم کے کام میں اگر کوتاہی رہ جاتی تو پھر اور کچھ بھی نہ ہوتا۔

دوسرا بڑا نتیجہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ العلم کے ساتھ مختلف دُنیوی علوم وفنون میں بھی مسلمانوں میں نہایت تیزی سے ترقی ہوئی اور ہیئت، نجوم، جغرافیہ، طب، جراحت، فلسفہ، سائنس، ریاضی، الجبرا، کتابت، نقاشی، تزئین، تعمیر، جنگی فنون، جہاز رانی، آہن گری، صیقل گری وغیرہ میں صدی دو صدی کے اندر مسلمانوں نے ایسے کارنامے انجام دیے کہ ان کی علمی قوت نے یورپ کو مرعوب کر کے اپنے دائرۂ اثر میں لے لیا۔

تیسرا سبق آموز نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ حضورؐ کی شروع کی تعلیمی مہم نے مسلمانوں میں ایسا فکری، تہذیبی استحکام پیدا کر دیا کہ انہوں نے یونان، ایران اور ہندوستان کے باطل اور فاسد علوم سیکھے مگر وہ ان سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے تنقیدی صلاحیتوں سے کام لے کر ہر چیز کو اپنے العلم کی کسوٹی پر پرکھا، پھر جو کچھ اس کے مطابق پایا اُسے قبول کیا اور جو کچھ اس کے خلاف پایا اسے یا تو تشکیلِ نَو کے عمل سے گزارا یا مسترد کر دیا۔ آج

---

[1] ترمذی۔ مناقب عشرہ مبشرہ۔ روایت انس۔

[2] بخاری ومسلم باب جامع المناقب، وعلم التواریخ، فنِ روایت ودرایت۔

جبکہ علمی پسماندگی کے ساتھ ساتھ داخلی طور پر فکری و تہذیبی استحکام موجود نہیں ہے اور بحیثیت ملّتِ اسلامیہ کے ہماری اجتماعی خودی کمزور ہوگئی ہے۔ ہم غالب اقوام کے نظریات اور علوم کے سامنے نہایت اطمینان سے شکست کھا کر فخر محسوس کرتے ہیں۔

کلمۂ آخر

آیئے، اس گفتگو کو ختم کرتے ہوئے ہم اپنے مقام کو دیکھیں کہ ہم کہاں کھڑے ہیں؟ ایک غیر قوم نے باہر سے آکر ہمیں اپنی ضرورتوں کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے ایک نظامِ تعلیم ہم پر مسلط کیا جو ملّتِ اسلامیہ کے مزاج کے خلاف تھا۔ نبیٔ اکرمؐ کی حکمت علم اور حکمت تعلیم کے خلاف تھا اور جس نے آہستہ آہستہ اپنے آپ سے بیگانہ کر دیا۔ اس نظامِ تعلیم کے تیزاب میں ہماری خودی اس طرح تحلیل ہوگئی کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد سالہا سال گزر جانے کے باوجود ہم اس تعلیمی قفس سے نجات نہیں پا سکتے۔

ایک خاص تہذیبی نظام کی علمبردار ملّت اور تحریکِ فلاحِ انسانیت کی مشعل بردار قوم اپنی ضرورت کا پورا نظامِ تعلیم خود بناتی ہے۔ وہ اپنے تعلیمی نظریات کی بنیاد اپنے ایمان و معتقدات پر رکھتی ہے۔ وہ نصابیات کے ہر جزو میں اپنے اجتماعی نصب العین کی روح داخل کرتی ہے۔ وہ اپنی حکمتِ تعلیم پر علوم کی بنیادیں رکھتی ہے اور اس کی تعلیم کا مقصد ایسے انسان تیار کرنا ہوتا ہے جیسے انسان مخصوص نظامِ حیات کو چلانے اور اس کی بین الانسانی تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے مطلوب ہوتے ہیں۔

میں ملک کے ذی شعور معلمین اور ماہرینِ تعلیم کو توجہ دلاؤں گا کہ وہ نبیٔ اکرمؐ کے تعلیمی کارنامے کی روشنی میں ملّتِ پاکستان کے لیے ایک صحت مند نظامِ تعلیم کا نقشہ مرتب کریں اور اسے موجودہ خلافِ ایمان اور خلافِ مزاج تعلیم سے نجات دلائیں جس نے ہماری نسلوں کو فکری اور اخلاقی لحاظ سے بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔

(ماخوذ از ماہنامہ "ترجمان القرآن")

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا

ارشاد ہے!

یہ آدمی کے اسلام کی خوبی اور حسن میں

سے ہے کہ وہ لایعنی چیزوں کو چھوڑ دے۔

یہ حدیث حسن ہے ترمذی وغیرہ نے اسے اسی طرح

روایت کیا۔